اُستاذ!.....ایک بہترین معلم اور مربی

حضرت مولانا عبید اللہ خالد مدظلہم

ہمارا سلسلۂ تعلیم وتعلّم اور درس وتدریس معلم اکبر اور مربی اعظم جناب نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جڑا ہوا ہے، اس لیے آج کے معلم اور مدارس دینیہ میں پڑھانے والے ہر مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ معلم انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسالیب تعلیم اور اندازِ تعلیم وتربیت کو سامنے رکھ کر سلسلۂ تعلیم وتربیت اور درس وتدریس کو آگے بڑھائے اور اسے نبوی اندازِ تعلیم کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔

حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم جس مرتبے کے معلم تھے اس مرتبے کو معلوم کرنے کی غرض سے اگر تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی کیا جائے تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے قبل کی انسانیت کو دیکھیں کہ اس کی کیا حالت تھی اور پھر کیا سے کیا ہوگئی، اس نے کن بلندیوں کو چھوا؟ (اس پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی) اندازہ ہو جائے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد نے دنیائے انسانیت میں ایک بے مثل اور بے نظیر انقلاب برپا کر دیا تھا۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ ان میں سے ہر فرد ایسا تھا کہ وہ اپنی اعلیٰ تربیت کا مظہر ہونے کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم ویکتا معلم ومربی ہونے کی منہ بولتی دلیل تھا۔

علم وعمل کے یہ چلتے پھرتے نمونے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہمیں ایک مشہور قانون دان کا وہ قول یاد دلاتے ہیں (جو معلم اور متعلمین کے بھرپور اعتراف کا مظہر ہے) اس نے کہا تھا کہ:

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) محمد عربی سے تربیت پانے والے حضرات کے سوا اگر محمد عربی کے پاس کوئی اور معجزہ نہ بھی ہوتا تب بھی ان اصحاب رسول کا وجود ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے لیے کافی تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازِ تعلیم کا مختصر خاکہ:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین سیکھنے والوں کے لیے انتہائی مہربان تھے، آسانی اور سہولت کو پسند فرماتے

تھے، طالب علم کے لیے انتہائی شفیق اور اس کے فائدے کے خواہاں رہتے، ہر وقت اور موقع کی مناسبت سے علم اور بھلائی کی باتیں بتاتے رہتے تھے، اونچے مرتبے اور بلند اخلاق کی سطح سے یہ باتیں سمجھاتے۔قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾. (سورہ التوبہ، آیت:128)

ترجمہ:''(لوگو!) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں، تمہاری تکلیف ان کو بھاری محسوس ہوتی ہے تمہاری بھلائی کے خواہاں ہیں اور مومنین پر انتہائی شفقت کرنے والے (اور) مہربان ہیں۔''

صاف اور واضح گفتگو:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو نہایت واضح، صاف، متین اور معتدل ہوتی تھی، مخاطب کو آپ کی سمجھنے میں کسی قسم کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔حدیث شریف میں ہے:

عن عائشة رضى الله عنها قالت: ماكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يسرد كسردكم هذا، ولكنه كان يتكلم بكلام بَيِّنٍ فصل يحفظه من جلس إليه.(الشمائل المحمدية المعروف، بـ"شمائل الترمذى": باب كيف كان كلام رسول الله صلى الله عليه وسلم، ح: 223، ت: محمد عوامة، ط: دار المنهاج)

ترجمہ:''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کی طرح جلدی جلدی تیزی سے گفتگو نہیں فرماتے تھے، بلکہ بات بالکل واضح اور اس طرح صاف فرماتے کہ لفظ صاف اور الگ الگ ہوتا جو اچھی طرح سمجھ میں آتا کہ سننے والا اس کو یاد کر لیتا۔''

شاگردوں کے لیے بار بار دہرانا:

حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے سوال کیا کہ آپ ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال سے آگاہ فرمائیے۔ کیوں کہ وہ (ہند) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات عالیہ کو بہت اچھی طرح بیان فرمایا کرتے تھے چناں چہ انہوں نے بتانا شروع کیا، فرمایا:

رسول اکرم بڑے فکر مند رہا کرتے تھے برابر (رسالت کے کام کے بارے میں) سوچتے رہتے تھے، کسی طرح قرار نہ آتا تھا، دیر تک خاموش رہ کر سوچ وبچار فرماتے تھے، بلاضرورت گفتگو نہ کرتے، اگر کرتے تو اللہ تعالیٰ کے

نام گرامی سے بات شروع فرماتے اور اسی پر ختم فرماتے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے جامع جملے استعمال فرماتے جن کے الفاظ کم اور معنی زیادہ ہوتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو بہت واضح اور اچھی طرح سمجھ میں آنے والی ہوتی، الفاظ کا استعمال ضرورت کے مطابق فرماتے جو نہ ضرورت سے کبھی زیادہ ہوتے نہ کم ہوتے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سخت مزاج اور سخت گو نہیں تھے، دیکھنے میں بڑے بارعب اور صاحب وقار معلوم ہوتے، اللہ کی نعمت کتنی چھوٹی کیوں نہ ہوتی اس کی بڑی قدر فرماتے، کسی نعمت کی برائی نہیں فرماتے تھے، دنیا داروں کی طرح کھانے پینے کی چیزوں کی نہ تو برائی بیان کرتے نہ بہت زیادہ تعریف کرتے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا یا دنیاوی اشیاء کے حوالے سے غصہ نہیں فرماتے تھے، لیکن اگر کوئی شرعی حکم توڑا جاتا تو کوئی چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غصہ کو نہ روک پاتی حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سرزنش نہ فرمالیں، اپنی ذات کے لیے نہ غصہ ہوتے نہ بدلہ لیتے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اشارہ فرماتے تو پوری ہتھیلی سے اشارہ فرماتے، کسی بات پر تعجب فرماتے تو ہتھیلی پلٹ دیتے۔ گفتگو کرتے تو ہتھیلی کو ملا لیتے اور دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے انگوٹھے کے اندرونی حصے پر مارتے، کسی سے ناراض ہوتے تو چہرے پر ناگواری ظاہر فرماتے اور غصہ کی وجہ سے اس شخص سے نہ ملتے، خوش ہوتے تو نگاہیں نیچی فرمالیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہنسی زیادہ سے زیادہ مسکراہٹ ہوتی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دانت برف کے چھوٹے چھوٹے دانوں کی طرح بڑے حسین نظر آتے۔ (شمائل ترمذی، باب کیف کان کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ص:353، ح(225)

صاحب رسالت معلم اول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی مجالس:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس کے لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ساتھ ہمیشہ خندہ پیشانی، حسن اخلاق اور لطف ومہربانی سے پیش آتے تھے، سخت اور درشت گفتگو کرنے والے نہ تھے، نہ طبیعت میں سختی تھی (یعنی ایسے سخت نہ تھے کہ لوگ اکتا کر یا تنگ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعراض کر بیٹھتے، جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ہے:

﴿وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾. (سورۃ آل عمران، الآیۃ:159)

ترجمہ: ''اگر آپ سخت گو اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور ہو جاتے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم چیخ کر بات کرنے والے نہ تھے، نہ زبان سے نازیبا الفاظ نکالتے، نہ عیب جوئی کرتے، نہ کسی کی بے جا تعریف کرتے، جو بات یا چیز پسند نہ آتی ایسا ظاہر کرتے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا یا سنا ہی نہ ہو (یہ عمل اپنے صحابہ پر لطف و مہربانی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر بات میں دخل اندازی سے پرہیز تھا، یہ انداز سرداروں اور عظیم بادشاہوں کا ہے) جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے امید کرتا وہ مایوس نہ ہوتا، اپنی امید میں ناکام نہ ہوتا۔ (یعنی آپ اس کی امید پوری فرماتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جود و سخا کے باعث وہ مایوس نہیں لوٹتا تھا)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو تین باتوں سے دور رکھا تھا۔ ❶ بحث و مباحثہ۔ ❷ ضرورت سے زائد گفتگو یا مال کو بڑھانا۔ ❸ بے مقصد باتیں۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں میں لوگوں کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ ❶ کسی کی مذمت کرنے اور خامیاں نکالنے سے پرہیز فرماتے۔ ❷ کسی کی خفیہ باتیں تلاش کرنے سے پرہیز فرماتے۔ ❸ صرف وہ گفتگو فرماتے جس سے ثواب کی امید ہو۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو فرماتے تو حاضرین یوں سر جھکا کر بیٹھتے گویا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں (یعنی سر جھکا کر نظریں زمین پر رکھ کر غور سے شوق کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنتے، یہ بڑوں اور سرداروں کی مجلس میں بیٹھنے کا ادب ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب گفتگو فرماتے تو لوگ خاموش ہو جاتے، اس بات کا لحاظ رکھتے کہ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو کر رہے ہوں تو آپس میں بات نہ کریں اور جب کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتا تو اس کے خاموش ہونے تک کوئی بات نہ کرتا تھا، جو شخص بات شروع کرتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بات سنتے (کسی کو اولیت کی تخصیص حاصل نہ تھی) جس بات پر صحابہ کو ہنسی آتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مسکراتے اور جس پر انہیں تعجب ہوتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تعجب کا اظہار فرماتے۔

کوئی نیا شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے میں غیر مہذب انداز اختیار کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے برداشت فرماتے حتی کہ اگر صحابہ ایسے (اجنبی، دیہاتیوں) کو پکڑ پکڑ کر لاتے تب بھی برداشت کرتے اور فرماتے کہ جب کوئی ضرورت مند آ کر سوال کرے تو اس کی ضرورت پوری کرو (پکڑ پکڑ کر لانے کا مطلب یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت ادب کی وجہ سے شرم کے مارے سوال نہیں کر پاتے تھے تو ایسے لوگوں کو پکڑ لاتے تاکہ یہ کوئی سوال کرے تو ہمیں بھی فائدہ ہو، اصل میں قرآن کریم کی آیت ﴿ لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ﴾ (سورۃ المائدۃ، الآیۃ: 101) کے بعد غیر ضروری سوال کرنے سے ممانعت ہو گئی

تھی؛ لہٰذا صحابہ کرام کسی اجنبی سمجھ دار شخص کا انتظار کرتے تا کہ وہ ادب وآداب کے ساتھ سوال کرے تو ہمیں فائدہ ہو ۔جیسا کہ ''مسلم''، ''نسائی'' کی احادیث سے ظاہر ہوتا ہے اور زاد المعاد میں اس بارے میں بحث کی گئی ہے۔)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس کے ہر شخص پر پوری توجہ فرماتے، چناں چہ ہر شخص کا خیال یہ ہوتا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے سب سے زیادہ محبت فرماتے ہیں۔(شمائل ترمذی، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ص:564، ح(364)

اس حدیث سے جہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت کمال تواضع معلوم ہوتی ہے وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرمی، لطف وکرم، رحم، حلم، درگذر اور عظیم اخلاق کی طرف بھی راہ نمائی ملتی ہے اور ایک معلم سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں یہی صفات مطلوب ہیں۔

اہل مجلس کے حقوق کی رعایت:

ایک اور روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہر ہم نشین کو اس کا حق دیتے یعنی پوری توجہ عطا فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھنے والا ہر شخص یہ سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر کوئی شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک زیادہ مقرب اور باعزت نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیکھنے والے، سائل اور کم سمجھ مگر استفادہ کرنے والے شخص کے لیے بھی نہایت متواضع تھے۔

کام یاب مدرس کیسے بنا جاسکتا ہے؟

معلم اکبر حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز تعلیم کو مختصراً ذکر کرنے کے بعد ایک دینی معلم کو کیا طرز تعلیم اختیار کرنا چاہیے؟ اور اسے درس کی کیسے تیاری کرنی چاہیے؟ اور طلبہ کے سامنے درس کو کس طرح پیش کرنا چاہیے؟ ذیل میں اس بارے میں چند ضروری باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

تدریس کے چار بنیادی اصول:

(۱) درس کی بہترین تیاری:

جو سبق پڑھانا ہے ضروری ہے کہ پہلے آپ خود اسے اچھی طرح سمجھتے ہوں درس کی کتاب کے ضروری لوازمات مثلاً اس کتاب کا مستند اور صحیح نسخہ اور مفید حواشی وشروحات ایک مدرس کے زیر مطالعہ ضرور ہوں۔ اس پر مستزاد یہ کہ پڑھائی جانے والی کتاب کے فن کے چند بنیادی مصادر اور اہم اور مفید مراجع بھی اگر مدرس کے پاس مراجعت کے لیے ہوں تو یہ استاد کو اس فن کا کامیاب مدرس بنانے میں مددگار اور اس کے درس کو چار چاند لگانے کے مترادف ہوگا۔

اسی طرح درس کے متعلق جو شبہات اور سوالات ایک طالب کے ذہن میں آسکتے ہیں، ان کی اور ان کے حل اور جوابات کی تفصیل آپ کے ذہن میں ہو۔ ظاہر ہے یہ چیز اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب آدمی نے متعلقہ سبق کے لیے بھرپور مطالعہ اور تیاری کی ہو، مطالعہ کو مختلف تدریجی مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور ہر آدمی اپنے ذوق اور وقت کے اعتبار سے ان میں طوالت اور اختصار سے کام لے سکتا ہے۔ لیکن اس قدر تیاری ہر استاذ کے لیے لازمی ہے کہ اوّلاً نفسِ عبارت کا حل ہو..... نفسِ سبق کے حل میں عبارت کا درست تلفظ..... اعرابی حالت کی درستگی..... مشکل الفاظ کے معنیٰ ..... عبارت کا مفہوم اور مقصد کو سمجھنا داخل ہے..... بسا اوقات کوئی لفظ محذوف ہوتا ہے..... یا عبارت کسی شے کا جواب ہوتی ہے..... کسی خاص بات سے احتراز کے لیے کوئی قید بڑھادی جاتی ہے..... حل عبارت میں ان تمام متعلقہ چیزوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔

(۲) تعبیر:

اچھی تدریس کی دوسری بنیاد ''تعبیر اور اظہار مافی الضمیر'' پر قدرت یعنی جس سبق کا آپ نے مطالعہ کیا ہے، تیاری کی ہے آپ خوب صورت اسلوب اور دل نشین انداز میں وہ طلبہ کے سامنے بیان کرسکیں، صحیح، واضح اور دل نشین تعبیر اور اندازِ بیان کے بغیر عمدہ تدریس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

ایک مدرس اور استاذ وسیع مطالعہ رکھتا ہے سبق کے مضمون اور متعلقہ بحثوں پر عبور اور گہری نظر رکھتا ہے لیکن اپنے مافی الضمیر کے اظہار اور طلبہ کے سامنے اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش کرنے کے لیے اس کے پاس لفظوں کے مناسب زبان نہیں ہے تو ایسے استاذ کے سبق اور علم سے طلبہ زیادہ استفادہ نہیں کرسکتے اور وہ ایک اچھا مدرس نہیں کہلاسکتا۔

''اظہار مافی الضمیر'' کی صلاحیت سے مراد: وہ خطیبانہ صلاحیت نہیں ہے جو وعظ وارشاد، جلسوں اور جمعہ کے خطبوں میں کام آتی ہے، وہ ایک مختلف چیز ہے اور اس کے اصول اور تقاضے بھی الگ ہیں، بل کہ اس سے مراد مدرّسانہ صلاحیت ہے جس کا اظہار مسندِ درس پر بیٹھ کر ہوتا ہے۔ یعنی جس سبق کی آپ نے رات کو تیاری ہے اس کو عام فہم اسلوب، آسان الفاظ اور دل نشین انداز میں طلبہ کے سامنے بیان کرنے کی ایسی صلاحیت ہو کہ درس میں وہ سبق بھی طلبہ کی سمجھ میں آجائے اور اسلوب کی شیرینی اور کلام کی مٹھاس سے بھی سامعین محظوظ ہوں، تعبیر کی حلاوت وشیرینی مشکل اور طویل سبق میں بھی انہیں اکتانے نہ دے۔

اس مشق اور محنت کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جو سبق آپ نے اگلے دن پڑھانا ہے، آپ پہلے

تنہائی میں اسے اس تصور کے ساتھ دُہرالیں کہ آپ درس گاہ میں طلبہ کے سامنے بیٹھ کر پڑھا رہے ہیں، تنہائی کے اس تجرباتی عمل میں آپ ایک مفہوم کی مختلف تعبیرات میں ترجمانی کی مشق کریں۔ اس مشق میں آپ کے سامنے ایک مفہوم کے لیے مختلف تعبیرات آئیں گی، آپ کا ذہن متنوع اسالیب اور اظہار کی مختلف شکلیں بنائے گا جس سے رفتہ رفتہ سبق پڑھانے کی عمدہ تعبیر کی صلاحیت اور مشکل سے مشکل مسئلہ چٹکیوں میں سمجھانے کا ملکہ ان شاء اللہ پیدا ہو جائے گا، اور کچھ عرصہ کے بعد پھر تنہائی کی اس تجرباتی تدریس کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

(۳) نظم وترتیب:

عمدہ تدریس کے لیے تیسرا بنیادی اصول ''نظم وترتیب'' ہے یعنی آپ نے درس کے لیے جو مطالعہ کیا ہے اور سبق کے متعلق جو کچھ آپ طلبہ کے سامنے کہنا چاہتے ہیں، ضروری ہے کہ اس میں آپ نے ذہنی خاکہ بنا کر ایک ترتیب اور نظم قائم کرلیا ہو کہ کون سی بات کہاں کہنی ہے اور کون سی بحث کس بحث سے پہلے یا بعد میں کرنی ہے؟

اگر آپ کو نفس درس اور اس کے اظہار دونوں پر تو عبور ہے لیکن اس میں بے ترتیبی کا نقص موجود ہے تو آپ کا سبق طلبہ کو ذہن نشین نہیں ہو سکے گا۔ پہلے سے ذہن میں نظم وترتیب قائم نہ کرنے کی وجہ سے اکثر ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ درس میں مطالعہ کی ہوئی مختلف باتوں کا ایک دم ذہن پر ہجوم ہونے سے آدمی تشویش کا شکار ہو جاتا ہے جو بات آخر میں کہنے کی ہوتی ہے وہ اول میں کہہ دی جاتی ہے اور جو اول میں کہنے کی تھی وہ آخر میں یا سرے سے یاد ہی نہیں رہتی ہے یا وہاں کہہ دی جاتی ہے جہاں اس کا موقع نہیں ہوتا، بدنظمی اور بے ترتیبی کا شاخسانہ اسی طرح ہوتا ہے اس لیے عمدہ تدریس کے لیے ذہن میں عمدہ نظم اور ترتیب بہر حال ضروری ہے۔

(۴) طلبہ کے معیار ومستویٰ کی رعایت:

تدریس میں طلبہ کے معیار اور مستوی کا خیال رکھنا بھی ایک ضروری امر ہے، ابتدائی طلبہ کے لیے سبق میں آسان اسلوب، عام فہم الفاظ اور علمی اصطلاحات کے بجائے عمومی زبان اختیار کرنی چاہیے، ایک بات کو بار بار دہرانا بھی ان کے لیے مفید ہوتا ہے، جب کہ اگلے درجوں میں علمی زبان اور فنی اصطلاحات کو بے تکلف استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہاں ایک لطیفہ یاد آ گیا جو علامہ دینوری رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب ''عیون الاخبار'' میں لکھا ہے کہ مشہور عالم ابن سماک رحمہ اللہ تقریر کر رہے تھے ان کی باندی گھر بیٹھی سن رہی تھی، وہ تقریر سے فارغ ہو کر گھر آئے اور باندی سے پوچھا ''میری تقریر کیسی رہی؟ اس نے جواب دیا: تقریر تو بہت اچھی تھی مگر ایک بات کو بار بار دہرانا سمجھ نہیں آیا، ابن سماک رحمہ اللہ نے کہا: میں بار بار اس لیے دہرا رہا تھا تاکہ جو نہیں سمجھا وہ سمجھ جائے۔ باندی نے کہا:

جب تک نہ سمجھنے والوں کو آپ سمجھاتے رہے اس وقت تک سمجھنے والے اکتاتے رہے۔

بہر حال طلبہ کی علمی صلاحیت ان کے درجے کے معیار اور مستویٰ کو پیش نظر رکھنا عمدہ تدریس کا ایک بنیادی اصول ہے؛ اور اس اصول کی رعایت ایک مدرس کو ضرور رکھنی چاہیے۔ نیز ہر شریک درس طالب علم کی حالت سے واقف ہونا بھی مدرس کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ کس حد تک سبق کو سمجھ رہا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً ہر طالب علم سے ایسے سوالات کرے جن سے سبق کے سمجھنے کا حال معلوم ہو سکے۔ اسی طرح بلا تعیین ہر طالب علم سے عبارت پڑھوائے......ترجمہ کرائے......مطلب بیان کرائے......گزشتہ سبق کے متعلق بلا تعیین مختلف طلبہ سے سوالات کرے تا کہ ہر طالب علم کتاب کو سمجھنے، سبق یاد کرنے اور مطالعہ کرنے پر مجبور ہو۔ عموماً مدرسین جماعت کے ذہین طلبہ کو پیش نظر رکھ کر درس دیتے ہیں۔ ان ہی سے سوالات کرتے ہیں، یہ طریقہ سخت مضر ہے، اس سے کمزور طلبہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور استفادہ سے محروم رہ جاتے ہیں، بلکہ وہ خود کو بالکل آزاد سمجھ لیتے ہیں او رپھر سننے اور سمجھنے کی جانب توجہ ہی نہیں کرتے، اسی لیے مدرس کا فرض ہے کہ وہ اپنے معیار علم کے مطابق درس نہ دے بلکہ طلبہ کے ذہنوں کی سطح پر اتر کر درس دے اور "اقتد باضعفھم" (یعنی کم زور طالب علم کی رعایت رکھنا) کے اصول پر عمل کرے تا کہ تعلیم کا فرض ادا کر سکے۔

ایک اہم تنبیہ:

اس لیے یہ بات ملحوظ رہے کہ تدریس کے ذکر کردہ یہ طریقے، یہ اصول اور یہ مبادی ایک طرف، ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان طریقوں سے آپ صرف خشک بحث اور محض فنی موضوع طلبہ تک منتقل کر سکتے ہیں، جو ایک مدرس کا بہر حال فرض منصبی ہے۔ لیکن علم کی اصل روح، علم کی نوارنیت اور علم کی وجد آفرین تاثیر منتقل کرنے کے لیے صرف ان اصولوں کی رعایت کافی نہیں بل کہ اس کے لیے دل کے اس درد، جگر کے اس سوز او رایمان کی کیفیت سے متصف ہونا ضروری ہے جو ایمانی زندگی اختیار کرنے کے بعد اللہ جل شانہ کی توفیق سے انسان کو حاصل ہوتی ہے......عمل صالح کی خوشبو سے معطر ایمان والی زندگی......جس میں دعا اور ابتہال ہو......رجوع إلی اللہ ہو......ندامت کے اشکوں سے روح وقلب کی کثافتوں کی تطہیر کا اہتمام ہو......جس کے اپنانے کے بعد دل کی پژمردگی وافسردگی نشاط وتازگی میں بدلے......دل کی سرد انگیٹھی میں حرارت آئے......اخلاص کی حرارت......شوق وجذبے کی حرارت......جگر کے سوز وگداز اور روح کی سیمابی کی حرارت......پھر جو بات زبان سے نکلے گی وہ جا کر دل پر لگے گی اور طلبہ کی زندگیوں میں خوشگوار دینی انقلاب کا ذریعہ بنے گی۔ (باقی آئندہ)